Fikr-o-Nasar vol.1: 7-8 (1964)© rasailojaraid.com

قانونی اساس کے لحاظ سے قرآن کریم کی ابدیت

ڈاکٹر فضل الرحمٰن

ہر مسلمان قرآن کو کلام الٰہی مانتا ہے اور اس کو ابدی صداقت کا حامل جانتا ہے۔ زمانۂ حال کے کچھ افراد کو چھوڑ کر سب مسلمان اس پر متفق ہیں اور رہے ہیں کہ قرآن نہ صرف اخلاق و عبادات کا ماخذ ہے بلکہ اسلامی قانون کی اساسِ اوّل بھی یہی ہے۔ لیکن دورِ حاضر کے کئی یا اکثر افراد نے قرآن (اور سنت نبوی) کو اساسِ قانون ماننے سے انکار کر دیا ہے اور غیر مذہبی قانون کے نظریہ کو اپنا لیا ہے۔ اس فکر کی تہہ میں جو خیال کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ معاشرے بدلتے رہتے ہیں اور معاشرے کے ساتھ ساتھ لامحالہ قانون کو بدلنا چاہیئے۔ لیکن قرآن کے قوانین کو اگر فی الواقع قوانین بھی تسلیم کر لیا جائے اور ابدی بھی تو معاشرے کی تغیرات پر ان کا انطباق محال ہے۔ لہٰذا نجات کی واحد صورت یہی سوچی گئی کہ قرآن کو اساس ماننے سے قطعی انکار کر دیا جائے۔

اس نظریے میں جتنی قوت ہے اس کا احساس مسلمانوں کو بظاہر نہیں ہے۔ اس نظریے نے پورے رسمی طور پر تو صرف ترکی میں جگہ بنائی ہے لیکن دیگر مسلمان ممالک میں بھی اس کے حامی بکثرت موجود ہیں۔ اگر دیگر ممالک میں اس نظریے کو کھلم کھلا اپنایا نہیں گیا تو اس کی وجہ صرف یہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ حکومتیں جانتی ہیں کہ علماء اور اکثر لوگ اس موقف کے شدید مخالف ہوں گے اور نوبت باہمی جدال و قتال تک پہنچ جائے گی۔ ان ممالک میں ایک کثیر تعداد ایسے تجدید پسندوں کی ہے جو قرآن کو اساسِ قانون اپناتے ہوئے تغیر حالات کے پیش نظر نیا اسلامی قانون مرتب کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ قرآنی تعبیر جدید کی کوئی ایسی خاطر خواہ صورت نہیں پیدا کر سکے جو ایک طرف قرآن کی ابدی صداقت کو بھی اپنائے اور دوسری طرف تبدیل پذیر معاشرے کی حقیقتوں کے ساتھ بھی انصاف کر سکے۔ لہذا ان کی تگ و دو بیشتر اسی تک محدود رہتی ہے کہ اکّا دکّا قانونی آیات قرآنی کو نئے نئے معنی پہنائیں اور نئی نئی تشریحیں کریں جو بسا اوقات لغت اور تاریخ کے حقائق کے ساتھ متصادم ہوتی ہیں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو غیر مذہبی (سیکولر) نظریۂ قانون میں اتنی ہی قوت و شدت ہے جتنی قرآنی ابدیت کے روایتی تعبیر کے مسلک میں جس پر علماء اور ان کے ہم خیال سختی سے جمے ہوئے ہیں۔ روایتی مسلک کے حامی روایت پرستی میں جس قدر غلو برتتے ہیں اسی قدر تجدد پسند اصحاب کا ردّعمل شدید ہوتا ہے۔ روایت پسند لوگ کہتے ہیں کہ جو چیز قرآن اور سنّت میں "منصوص" ہو چکی ہے وہ تو کسی حال میں بھی معاشرے کے تغیرات کے ساتھ ساتھ "تبدیل" نہیں کی جا سکتی (اگرچہ ان میں سے اکثر تو ایسے حضرات ہیں جو فقہ کو بھی ناقابل تبدیل سمجھتے ہیں) لیکن چونکہ معاشرے میں طرح طرح کی تبدیلیاں ناگزیر ہیں جن کے ساتھ ساتھ اربابِ حل و عقد کو چلنا لازمی ہوتا ہے (اس لئے کہ اربابِ اقتدار کا سروکار کتابی مسائل سے نہیں بلکہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے ہوتا ہے) نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جلد یا بدیر قرآنی ابدیت کی اس روایتی تعبیر کے حاملوں کے ہاتھوں تنگ آ کر یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ قانون کو اصلاً مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ بنا بریں غیر مذہبی نظریۂ قانون کی اولین ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں۔ اور قرآنی ابدیت کی روایتی تعبیر کے حامل ہیں اور اس کے علاوہ کوئی اور تعبیر ممکن نہیں سمجھتے۔

اس بات کو ہم ایک مثال سے واضح کر سکتے ہیں۔

قرآن نے روزِ اول سے ہی اقتصادی عدل پر زور دینا شروع کیا تھا۔ مکّی دور میں خیرات،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صدقات اور زکوٰۃ کا جابجا اور تاکید کے ساتھ ذکر ہے۔ مدینہ میں جب پہلی بار مسلمان اپنی مستقل ریاست تشکیل کرنے کے قابل ہوئے تو زکوٰۃ کو باقاعدہ ٹیکس کے طور پر عائد کیا گیا۔ نماز اور زکوٰۃ کا جابجا اکٹھا ذکر قرآن نے کیا۔ زکوٰۃ کے مصارف جو قرآن نے گنائے ہیں ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس سے مراد قرآن کی یہ تھی کہ سماجی بہبود کا کام ہو اور ٹیکیشن کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ایک رفاہی ریاست اور عوامی بہبود پر مبنی معاشرہ قائم کیا جائے۔ زکوٰۃ کی شرح سرمایہ پر اڑھائی فی صد لگائی گئی۔ اس سے یہ یقینی علم ہوا کہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں یہ شرح اس معاشرہ کی رفاہی ضروریات کو پورا کرتی تھی۔ لیکن رسول اکرمؐ کے بعد جتنے مزید ٹیکسوں کی ضرورت پڑتی رہی ان کو خارج از زکوٰۃ سمجھا گیا۔ اور زکوٰۃ کی شرح کو "منصوص" سمجھ کر اس سے تجاوز کرنا دینی طور پر ناممکن سمجھا گیا۔

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ قرآن کریم اور رسول اکرمؐ نے (دیگر اختیاری نفلی صدقات کے علاوہ) رسمی ٹیکس صرف زکوٰۃ ہی لگایا تھا۔ یہ بھی ایک مسلّم حقیقت ہے کہ اس واحد رسمی ٹیکس کی علتِ غائی معاشرہ کی بہبود تھی۔ ان دونوں باتوں سے یہ لازم آتا ہے کہ اس زمانے کے معاشرے اور اس کی معاشرتی بہبود کی ضروریات کے لئے یہ فی الجملہ کفایت کرتا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر موجودہ معاشرے کی بہبود کی ضروریات بہت زیادہ ہیں تو ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جو بھی رسمی ٹیکس مسلمانوں پر عائد کیا جائے وہ زکوٰۃ کیوں نہ ہو؟ جب یہ سوال اٹھایا جاتا ہے تو روایتی موقف کے ترجمان فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی شرح تو بالکل تبدیل نہیں کیا جا سکتا لیکن ایک مسلمان حکومت کو ہر وقت حق حاصل ہے کہ اگر زکوٰۃ کافی نہیں تو دیگر ٹیکس عائد کر دے۔ اس جواب پر جدید سیاسی صاحبِ اقتدار کچھ اس طرز پر سوچتا ہے کہ "اس طرح ٹیکیشن میں غیر ضروری دوئی پیدا ہو جائے گی۔ ایک طرف تو ایک "خالص اسلامی" ٹیکس معاشرے کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس لئے دوسری طرف دیگر قسم کے ٹیکس عائد کرنے پڑتے ہیں" جب معاملہ یہاں تک طول کھینچتا ہے تو تجدد پسند سامنے آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر واقعی زکوٰۃ کو فعّال بنانا ہے اور اس سے اس کا بنیادی مقصد یعنی ایک رفاہی معاشرہ کا قیام حاصل کرنا ہے تو زکوٰۃ کی شرح میں تبدیلی ضروری ہے۔ بغیر اس تبدیلی کے نفس زکوٰۃ کا مقصد فوت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اب رفاہی معاشرے کے قیام کے لئے جو ٹیکس مسلمان دے گا وہ زکوٰۃ ہوں گے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر قرآن اور رسول اکرمؐ کا مقصد زکوٰۃ سے رفاہی معاشرے کا قیام تھا اور اگر آج فرض کرو اس کے لئے دس یا پندرہ فی صد ٹیکس ضروری ہے تو اگر رسول اکرمؐ اب موجود ہوتے تو وہ یقیناً یہی شرح مقرر فرماتے۔ اس لئے اگر ایسا نہ کیا جائے تو اسلام ناقابل عمل ہوجاتا ہے اس پر روائتی موقف کا نمائندہ متجدد سے کہتا ہے کہ تم اسلام کو تبدیل کرنے پر اتر آئے ہو۔ زکوٰۃ اور اس کی "منصوص" شرح میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاوہ اور ٹیکس عائد کئے جاسکتے ہیں۔ اس جدال میں لبا اوقات سیاسی صاحب اقتدار جسے بہرحال معاشرے کی اصلاح کا عملی اور سنگین مسئلہ پیش نظر رہتا ہے روایت پسندانہ اور متجددانہ دونوں موقفوں کے حامیوں کو ترک کرکے غیر مذہبیت کی راہ لیتا ہے۔

اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ یعنی اسلام کو میدان حیات سے دور کرنے اور ناقابل عمل بنانے اور غیر مذہبیت کو برپا کرنے کا حقیقی ذمہ دار کون ہے؟ کیا وہ شخص نہیں ہے جو بزعم خود "منصوص" پر اڑا ہوا ہے اور یہ بھولا ہوا ہے کہ ان نصّی احکام کا ایک خاص پس منظر، خاص حالات اور خاص گرد و پیش سے ربط ہے اور یہ کہ درحقیقت ان نصّی احکام کی جان ان کی علّت غائی اور ان کا مقصد ہے اور یہ کہ چاہے حالات کچھ ہوں نص پر سختی سے اڑے رہنے سے علّت غائی اور مقصد حقیقی فوت ہوجانا یقینی ہے؟ ہم نے صرف ایک مثال "زکوٰۃ" کی لی ہے ورنہ پورے اجتماعی فقہی مسائل میں صورت یہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علماء نے پہلی ڈھائی تین صدیوں کے بعد جب ایک فقہ کا نظام (جسے شریعت کا لقب بھی دیا گیا)، مرتب کیا تو اس سے آگے نہ بڑھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں سلاطین اور سیاسی اصحاب اقتدار نے اپنے قانون بنائے اور فرامین جاری کرنے شروع کردیئے علمائے خود ان کو ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ اپنے روایتی ورثہ میں علماء کوئی معتدبہ تبدیلی کرنے کو تیار نہ تھے کیونکہ یہ "شریعت میں مداخلت" تھی۔ اس لئے انھوں نے "شریعت" کو تو مضبوطی سے پکڑے رکھا لیکن زمین ان کے پاؤں تلے سے نکلتی گئی۔ اصحاب اقتدار کو چونکہ حقیقی مسائل حل کرنے تھے اگر ان کا جواب "شریعت" میں نہیں تھا تو نتیجتاً انھیں اپنے "قانون" نافذ کرنے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ معاملہ دولت عثمانی میں خاص طور پر تقریباً ایک رسمی پیمانے پر چل نکلا۔ سلطانی "قانون" کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا لیکن شریعت کے ترجمان اپنی جگہ پر اڑے رہے اور شریعت کی کوئی نئی تعبیر کرنے کے مخالف رہے۔ جب نیا دور آیا تو نئے ارباب اقتدار نے سوچا (اور وہ ایسا سوچنے میں حق بجانب تھے) کہ اہل شریعت تو فقہ کی کوئی معتدبہ نئی ترجمانی اور تعبیر نہیں کریں گے۔ کیونکہ انھوں نے تو اپنا راستہ مدت سے مسدود کر رکھا ہے۔ لہٰذا قانون میں "دوئی" کی کیا ضرورت ہے! کیوں نہ ہم صرف قانون ہی باقی رکھیں جس کی نئی تعبیرات بوقت ضرورت بالکل ممکن ہیں۔ اور فقہ یا شرعی قانون کو بالکل جواب دے دیں کیونکہ اس نے خود ہمیں مدت سے جواب دے رکھا ہے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ روائتی موقف کا نمائندہ جو تجدّد پسند کو "اسلام کو تبدیل کرنے" کا طعنہ دے کر کہا کرتا تھا۔

بے وفا سمجھیں تمہیں اہل حرم اس سے بچو

اور اپنے آپ کو قرآن اور سنّت کا علمبردار سمجھتا تھا بنظر غائر دیکھنے پر اسلام کو معطل کرنے اور زندگی کی رَو سے بے دخل کرنے کا حقیقی ذمہ دار نکلا۔ وقال الرسولُ یارَبِّ اِنَّ قومی اتخذوا ھٰذا القرآن مھجوراً۔

گلہ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
جو میں بتکدے میں بیاں کروں تو صنم پکارے ہری ہری

حقیقت یہ ہے کہ اس پورے المیہ کی بنیاد جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں قرآن کی ابدیت کی روائتی تعبیر ہے جو قرآنی وحی (اور سنّت) میں حالات زمانہ اور گردوپیش کے پس منظر کو ذرہ بھر اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں کیونکہ ایسا کرنا (باوجود اس کے کہ وہ شان نزول کے قائل ضرور ہیں) اس موقف کے حامیوں کے نزدیک قرآن کو مقامی اور زمانی بنا دے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روائتی موقف کا حامی خود قرآن کو بالکل مقامی اور زمانی بناتا ہے۔ کیونکہ جب وہ اصرار کرتا ہے کہ قرآنی احکام کے دائرۂ عمل کے علاوہ ان احکام کا تاریخی اور سماجی پس منظر بھی دائمی ہے تو گویا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ تاریخ کو آگے نہیں بڑھنا چاہیئے بلکہ تاریخ اور سماجی گردش کو قرآنی وحی کے ہمعصر عرب سماج کے تاریخی ڈھانچے [illegible] کے سے رکتی نہیں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندگی کا دھارا برابر بہتا چلا جا رہا ہے۔ اور وہ ساتویں صدی عیسوی کے اوائل کو من وعن ابدالآباد تک دہراتے رہنے سے قاصر ہے لہذا اس نے حال اور مستقبل میں بسنے کے بجائے ماضی میں بسنا شروع کردیا۔ وہ اپنے دور کا ہم عصر نہیں رہا اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس کے بالمقابل متجدد کہتا ہے کہ قرآن حکیم کے احکام کو بڑی گیرائی کے ساتھ ان کے تاریخی اور سماجی پس منظر کے پیش نظر سمجھنے کی کوشش لازمی ہے۔۔۔ اس طرح قرآنی احکام کے علل کا استخراج پوری ذمہ داری سے کرکے ان علل کی اساس پر ماضی کی روشنی میں ایک نیا مستقبل تعمیر کیا جائے۔ یہ حقیقی معنی ہیں قرآن کو عملی جامہ پہنانے کے۔ اگر متجدد کامیابی سے یہ کام سرانجام دے سکے تو وہ نہ صرف اپنے دور کا ہم عصر ہو سکتا ہے بلکہ ایک شاندار اور مثبت اسلامی مستقبل کا خالق بھی۔ قرآنی ابدیت کی روائتی تعبیر ایک اور اہم روایتی موقف کے ساتھ ٹکراتی ہے اور اس کا بظاہر کوئی حل نہیں۔ قرآنی ابدیت کی روائتی تعبیر کے مطابق قرآنی احکام کو من وعن بمع تاریخی اور سماجی پس منظر کے ابدیت حاصل ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ناسخ اور منسوخ کے بھی قائل ہیں یعنی اس بات کے کہ قرآن میں خدا نے کچھ احکام دیئے ہیں اور بعد میں ان کو منسوخ کرکے ان کی جگہ تازہ احکام نافذ کئے ہیں۔ لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ خدا نے ایسا کیوں کیا تو اس کا سوائے اس کے اور کوئی معقول جواب نہیں کہ خداوند تعالیٰ نے پہلے حالات کے پیش نظر کچھ احکامات دیئے بعد میں جب وہ حالات تبدیل ہو گئے تو اور احکامات دیئے۔

سوال یہ ہے کہ کیا قرآنی وحی کے اختتام کے بعد حالات اپنی جگہ پر ہی جمے رہے ہیں؟ جب یہ سوال اٹھایا جائے گا تو روائتی موقف کا ترجمان صرف ایک ہی بات کر سکتا ہے کہ اگرچہ حالات تو بدلے ہیں لیکن چونکہ کوئی اور وحی نازل نہیں ہوئی جو نئے احکام صادر فرمائے۔ اس لئے قرآن کے اندر جو "ناسخ" احکام موجود ہیں خدا کی رضا ان کے متعلق یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ابدالآباد تک جاری رہیں اور "الیوم اکملت لکم دینکم" الآیہ (سورۃ المائدہ۔ آیت ۳) کا یہی معنی ہے۔ یہ جواب اتنا بدیہی طور پر فاسد ہے کہ اس کی تنقید کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہ کی جانی چاہیئے۔

یہ بات کہ قرآنی وحی کے اختتام کے بعد کوئی وحی نہیں آئی نہ آئے گی، بالکل برحق ہے اور اس کے حق ہونے پر تاریخ خود شاہد ہے۔ لیکن نہ تو قرآنی ابدیت کی روائتی تعبیر اور نہ ناسخ و منسوخ کا نظریہ اس مسئلہ کا کوئی حل ہے کہ قرآن کو عملی جامہ کیسے پہنایا جائے۔ [illegible] قرآنی ابدیت کے روائتی تصور کو رد کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے دلائل ہم پہلے دے چکے ہیں لیکن یہ بات کہ روائتی موقف کو ناسخ و منسوخ کا نظریہ بھی اپنا نا پڑا ابدیت کے اس تصور کی ایک زبردست تردید ہے۔ کیونکہ اگر خداوند تعالیٰ کو کچھ احکام نافذ کرکے پھر منسوخ کرنے پڑے تو آخر ایسا کیوں کرنا پڑا؟ اور کیا ان پہلے احکام میں نزول کے وقت وحی الٰہی ہونے کے سبب ابدیت تھی یا نہیں اور کیا منسوخ ہونے پر وہ وحی الٰہی نہیں رہے کہ ابدیت سے معرّا ہو جائیں؟ ابدیت کے اس تصور کی رو سے ناسخ و منسوخ کے مسئلہ پر ان سوالات کے اطمینان بخش جوابات دینا ازبس ضروری ہے۔ مثلاً مکہ میں مسلمانوں کو جہاد کا حکم نہ تھا بلکہ صبر کی تلقین تھی۔ مکّی زندگی کے غالباً آخر میں وہ آیت اتری ہے جس میں حکم ہے کہ

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به ولئن صبرتم لهو خير للصٰبرين (النحل، آیت ۱۲۶)	(اتم اتنی ہی سزا دو جتنی کہ ایذا تم کو دی گئی ہو یعنی کہ بس بدلہ لے لو اور زیادتی نہ کرو اور پھر بھی صبر کرو تو بہتر ہے)

مدنی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد ہی جہاد کا اذن ملا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نئے احکام مکّی احکام سے مختلف تھے۔ پھر خود جہاد کے بارے میں کئی مختلف احکام دیئے گئے۔ لیکن کیا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ قرآن کو من حیث المجموع علیٰ جامہ پہنانا لازمی ہے اور قرآنی احکام کو عمل میں لانے کا یہی واحد طریقہ ہے۔ جہاں قرآن احکام دیتا ہے وہاں ان کے تاریخی اور سماجی پس منظروں کو دیکھنا اور ان کے پیش نظر علل الاحکام کا استنباط کرنا ضروری ہے۔ اور چونکہ حالات لوٹ کر کبھی بھی اسی حالت پر نہیں آتے جیسے کہ بعینہ پہلے تھے تو ان علل الاحکام کو اب ہمارے نئے ماحول میں نئے پس منظروں کے ساتھ نافذ کیا جائے اور ان کو ایک نئی قانونی شکل دی جائے۔

ناسخ و منسوخ کے مسئلہ اور قرآنی ابدیت کے روایتی موقف کے لئے جہاد کے یہ قرآنی احکام جن کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا ہے ایک ناقابل حل سوال اٹھاتے ہیں۔ لیکن باقی اقتصادی اور سماجی قوانین کا بھی یہی حال ہے۔ یہی حال مثلاً موجودہ بنکنگ کا ہے جس کے متعلق ہم "فکر و نظر" میں پہلے لکھ چکے ہیں۔

© rasailojaraid.com